باب۔۸

ترجمہ

فص یعقوبیہ

حکمت روحیہ

دین کے تین لغوی معنٰی ہیں۔ ۱)انقیاد و اطاعت۔ ۲)جزا۔ ۳)عادت۔ یہ تینوں معنٰی کا لحاظ دین بمعنٰی مذہب میں ہے۔ اس لیے کہ جو عقیدے اور احکام پیغمبر لاتے ہیں ان کے انقیاد (یعنی فرماں برداری) پر جزا مرتب ہوتی ہے اور اس پر عمل کرنے اور عادت کرنے پر ثواب موقوف ہے۔

دین دو قسم پر ہے۔ (۱)دینِ حق ۔(۲)دینِ خلق۔۔۔ دینِ حق وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ اللہ نے اس کی تعلیم پیغمبر کو دی۔ پیغمبر نے علما و عرفا کو اور وہ یعنی دینِ الٰہی زمانۂ پیغمبر سے ہم تک مروی و متوارث ہے،(یہ تعلیم مسلسل روایت کی جارہی ہے اور ہم تک پہنچ رہی ہے)۔۔۔دینِ خلق جس کو علما و عرفا نے اغراض و مقاصدِ شرعیہ کا لحاظ کر کے، مثلاً معارفِ الٰہیہ، کمالاتِ نفسانیہ و مراتبِ اخرویہ کے لیے ایجاد و اختراع کیا ہے، ایسے کاموں کو بھی حق تعالیٰ نے قابل اعتبار ٹھیرایا ہے۔

وہ دین جو حق تعالیٰ کے پاس کا ہے وہ خدائے تعالیٰ کا انتخاب و پسند کیا ہوا اور اس کا جاری کیا ہوا ہے۔ دینِ حق کو دینِ خلق پر مرتبۂ عالی بخشا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَوَصّٰی بِھَا[(یعنی)اور اسی (دینِ توحید) کی ہدایت کی،(البقرۃ:۱۳۲)]۔ ابراہیمؑ و یعقوبؑ نے اسی دین کی وصیت اور پابندی کرنے کا حکم دیا کہ اے میرے بچو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے دین پسند فرمایا۔ پس نہ مرو مگر مسلمان، یعنی فرماں بردار۔۔۔الدّین میں الف، غلام عہد کا ہے یعنی جو مخاطب کو معلوم و معروف ہے۔ اور اس دینِ معلوم پر قولِ حق تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّـهِ الْإِسْلَامُ،(یعنی)اللہ کے پاس جو دین معتبر ہے وہ اسلام ہی ہے،(اٰل عمران:۱۹)۔ اسلام کیا ہے۔۔؟ احکام الٰہی کا تمھارا مطیع و منقاد ہونا۔ پس اسلام تمھارا انقیاد ہے تو دین بھی تمھارا انقیاد ہے۔

وہ دین جو معتبر عند اللہ ہے، جو شرع ہے، جس کے تم مطیع و منقاد ہو۔ پس دین کا نام تمھارے انقیاد کے لحاظ سے ہے اور ناموس کا لفظ باعتبار خدائے تعالیٰ کے جاری کرنے کے ہے۔ جس نے احکام الٰہی کی اطاعت

کی وہ دین کے ساتھ قائم ہونے والا اور اس کو قائم کرنے والا ہو یعنی اس کو ظاہر کرنے والا ہوا۔ مثلاً نماز پڑھنا۔ پس بندہ، دین کو قائم کرنے والا اور اللہ کے احکام کا واضع اور مقرر کرنے والا ہوا۔ اطاعت و انقیاد تو تمھارا فعل ہے۔ پس تمھاری خوش بختی تو اس انقیاد (یعنی فرمانبر داری) سے ہوئی جو تم سے ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے تمھاری سعادت و خوش بختی تمھارے فعل یعنی انقیاد (واطاعت) سے ہے۔ ایسا ہی اسمائے فعلیۂ الٰہیہ کو افعال الٰہی ظاہر کرتے ہیں۔ وہ افعال کیا ہیں۔ ؟ تم ہی تو ہو جو پیدا کیے گئے ہو۔ وہ آثار ہی سے اللہ اور رب سے موسوم ہوتا ہے اور تم اپنے افعال و آثار سے سعید ہوتے ہو۔ جس طرح تمھارے انقیاد سے اس کا دین قائم و ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح تم سے اس کے اسما و افعال ظاہر ہوتے ہیں۔ انشاء اللہ میں انقیاد کے معنیٰ دینِ خلق کے بعد بسط و تفصیل سے بیان کروں گا جس سے بڑا فائدہ ہو گا۔

چوں کہ خلق، بر بنائے مقاصدِ دینیہ، چند امور کو اپنے پر لازم کر لیتی ہے تو اللہ کے پاس وہ امور معتبر و قابل لحاظ سمجھے جاتے ہیں۔ پس دینِ حق ہو یا دینِ خلق سب خدا کے ہیں، کیوں کہ اس کے جاری کیے ہوئے یا اس کے پاس اعتبار کیے ہوئے ہیں۔ نیز ہر طرح کا دین تم سے ہے، نہ کہ اُس سے۔۔۔ اس لیے کہ تم اس کی اطاعت کرتے ہو، اس کے احکام بجالاتے ہو اور وہ دین تمھارے ہی افعال ہیں۔ ان سب کا مرجع، سب کی اصل حق تعالیٰ ہی ہے۔ اس لحاظ سے دین بھی حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ دینِ خلق کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا [(یعنی) اور رہبانیت، جس کو انہوں نے ایجاد کیا تھا، (الحدید: ۲۷)]، یعنی وہ طریقہ کہ زاہدان و فقرائے امتِ عیسیٰ علیہ السلام نے ایجاد کیا تھا۔۔۔ یہ رہبانیت (یا گوشہ نشینی) کیا تھی۔۔۔؟ شرایع و احکام تھے، جو حکمتِ الٰہیہ و مصلحتِ دینیہ پر مشتمل تھے۔ مگر ان احکام کی طرف رسول و پیغمبر نے عامۃ الناس کو دعوت نہیں دی۔ اس لیے کہ وہ وحیِ جلی سے مامور نہیں ہوئے تھے۔

چوں کہ رہبانیت (یا قلندری) کے مصالح و حکم مقصود و غایت کے لحاظ سے حکم الٰہی کے موافق ہوئے جو شریعتِ الٰہی کے وضع کرنے سے حاصل ہوتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اسی طرح معتبر رکھا جیسے اپنی جاری کردہ شریعت کو ان کے لیے معتبر رکھا تھا۔ مگر اس رہبانیت کے احکام کو ان پر فرض نہیں کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اور ان کے دلوں کے درمیان عنایت و رحمت کا دروازہ اس طرف سے کھولا جدھر سے ان کو نہ امید تھی نہ علم و شعور، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں انھیں کے ایجاد کردہ طریقے کی عظمت و منزلت ڈالی۔ وہ لوگ اس طریقے سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی طلب کرنے لگے۔ یہ طریقۂ غیر ہے طریقۂ نبویہ سے، جو عام طور سے مشہور ہے اور اللہ کا بذریعۂ وحی بتلایا ہوا ہے۔ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّـهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا [یعنی (یہ رہبانیت کیوں اختیار کی تھی۔۔؟) صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے، پھر انھوں نے رہبانیت کی پوری پوری

رعایت نہ کی،(الحدید: ۲۷)]۔ان لوگوں نے جس قدر ہو سکا اس رہبانیت کی رعایت (اور اس کا) لحاظ کیوں کیا۔۔؟ اللہ کی رضاجوئی کے لیے۔ قرآن شریف میں آیت اس طرح ہے، وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّـهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا،(یعنی) اور طریقۂ خداترسی جس کو انہوں نے ایجاد کیا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا، اس طریقے کو انھوں نے خدا کی رضاجوئی کے خیال سے ایجاد کیا تھا مگر اس کے جتنا پابند رہنا چاہیے تھا نہ رہے،(الحدید:۲۷)۔ اس طریقے کی جتنی رعایت کرنی چاہیے تھی، نہ کی۔ ان لوگوں نے اپنے طریقے میں رضاے الٰہی حاصل ہونے کا عقیدہ کر لیا تھا۔فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ،(یعنی) پس ہم نے ان کے طریقے پر ایمان رکھنے والوں، مطیع و منقاد ہونے والوں کو اجر دیا، اور ان لوگوں میں سے اکثر فاسق اور اطاعت و حقِ ادائی سے خارج ہیں، یا قاصر ہیں،(الحدید:۲۷)۔ جو شریعت کا منقاد نہ ہو گا تو صاحبِ شریعت کی اس رضاجوئی کا کیا لحاظ کرے گا۔ مگر شانِ الٰہی یہ ہے کہ ہر ایک (کو) اس کا مطیع و منقاد ہی رہنا چاہیے، گو اپنی مرضی کے خلاف ہی ہو۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ مکلف، امتثالِ حکم (یعنی تعمیلِ حکم کی ذمے داری) کے لحاظ سے موافق ہو گا یا مخالف۔۔؟ موافق حکم مطیع و منقاد میں کوئی کلام ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ظاہر ہے اور حکم کی مخالفت کرنے والا اللہ سے ان دو باتوں میں سے ایک بات کا باعث و طالب ہو گا: ۱) اس کی خطا در گزر کرے اور معاف فرمادے۔ ۲) اس پر مواخذہ فرمادے۔ ان دونوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ امر فی نفسہٖ حق ہے اور مقتضاے طبیعت کے موافق ہے۔ بہر حال خواہ عفو ہو یا مواخذہ، حق تعالیٰ کو اپنے بندے کے افعال و مقتضاے حال کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ حق تعالیٰ بندے کے عینِ ثابتہ کی استعداد کے موافق عمل کرے گا۔ پس حال ہی موثر ہوا۔ یہی وجہ تو ہے کہ دین جزا و معاوضہ ہوا۔ خواہ بندے کو راضی رکھے یا ناراض، باعثِ سرور ہو یا نہ ہو۔

سرور بخشنے والی جزا، رَّضِيَ اللَّـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ،(یعنی) اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے،(المائدۃ:۱۱۹ اور کئی آیات میں)، یہ جزا سرور بخش ہے۔ وَمَن يَظْلِم مِّنكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا،(یعنی) جو شخص تم میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو بڑا عذاب چکھائیں گے،(الفرقان:۱۹)۔ اور وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ [(یعنی) ہم ان کی غلطیوں کو در گزر کرتے ہیں،(الاحقاف:۱۶)]۔ اللہ در گزر کرتا ہے ان کے گناہوں سے، یہ بھی ان کے موافق جزا ہے۔ اس تقریر سے (یہ) صحیح ثابت ہوا کہ دین، جزا و بدلہ و معاوضہ ہی ہے۔ جیسے کہ دینِ اسلام ہے اور اسلام منقاد و رام ہونا، تابع ہونا ہی ہے۔ بہر حال یہ اس فعل کا تابع ہوا جو اُس کو خوش کرے یا ناخوش کرے اور یہی جزا و بدلہ ہے۔ ہم نے یہ جو کچھ بیان کیا ظاہر شریعت کی زبان سے تھا۔

اس کا سرّ (راز) اور باطن یہ ہے کہ جزا، آئینۂ وجودِ حقیقی میں تجلّیِ حق تعالیٰ کے اسم "دیان" کی ہے۔ پھر ممکنات کی طرف وہی چیزیں عَود کریں گی (پلٹ کر آئیں گی) جن کو ان کی ذاتوں و اعیان ثابتہ نے ان کے حالات میں دیا ہے۔ کیوں کہ ممکنات کی ہر حالت میں ایک نئی ہی صورت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالات کے اختلاف سے ان کی صورتیں مختلف ہوتی رہتی ہیں۔ پھر تجلّیِ الٰہی بھی ممکنات کے حالات کے اختلاف سے مختلف نمایاں ہوتی ہے۔ پس بندے پر تجلّیِ الٰہی کا اثر بندے کے حال کے مطابق پڑتا ہے۔ پس بندے کو خیر دیا ہے تو خود اس بندے نے، اور شر دیا ہے تو خود اس بندے نے۔ اللہ نے تو عین کی استعداد کے مطابق کام کیا ہے۔ بندہ اپنے آپ ہی منعم ہے (اور) آپ ہی معذب ہے۔ ثواب و عذاب کا باعث ہے۔ لہٰذا مذمت کرنی ہو تو اپنی کرو اور تعریف کرنی ہو تو اپنی کرو۔ اللہ کی پوری پوری حجت قائم ہو گئی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو ممکنات اور ان کے اعیان کا علم ہے اور علم تابعِ معلوم ہے۔ پس جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا، معلوم یعنی حقیقتِ ممکنہ اور اس کے عین کے اقتضا کے مطابق کیا۔

پھر وہ سرّ (یا اصل بات) جو مسئلے میں اس سے بھی اعلیٰ ہے، یہ ہے کہ ممکنات اپنے عدم اصلی پر ہیں۔ وجود ہے تو حق تعالیٰ کا ہے، مگر ان حالات کی صورتوں پر ظاہر ہے جس پر ممکنات فی نفسہٖ اپنے اعیان ثابتہ میں ہیں۔ اب تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ لذت پاتا ہے تو کون اور رنج اٹھاتا ہے تو کون۔۔؟ اور کون اپنا تماشا آپ دیکھتا ہے۔۔؟ اور کیا ہر ہر حال میں چیز یکے بعد دیگرے آتی ہے۔۔؟ اس کا تعاقب اور یکے بعد دیگرے آنے کی وجہ سے جزا کا نام عقوبت و عقاب لکھا گیا ہے۔ مگر عرف و محاورے میں، خیر میں "ثواب"، اور شر میں "عقاب" (یا عذاب) کہتے ہیں۔ اسی واسطے دین کے معنیٰ اور اس کی شرح "عادت" سے بھی کی گئی ہے۔ یعنی دین کے معنیٰ عادت کے بھی ہیں۔ اس لیے کہ صاحبِ دین کی طرف وہی چیز عَود کرتی ہے جو اس کا مقتضی اور اس کے حال کا مطالبہ ہے۔ پس دین کے معنیٰ عادت کے ہوئے۔ امرء القیس کہتا ہے کدیک من امّ الحویرث قبلها، (یعنی) جیسی تیری عادت تھی عینزہ سے پہلے امّ الحویرث کے ساتھ۔ عادت کے معنیٰ، جو سمجھ میں آتے ہیں یہ ہیں کہ کوئی امر بعینہٖ اپنی حالت کی طرف عَود کرے۔ مگر تکرار و عَود کے معنیٰ وجود میں نہیں لیے جاسکتے۔ کیوں کہ تجلّیِ الٰہی میں تکرار و عَود نہیں۔ وہ، كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ، [(یعنی) ہر آن اس کی نئی شان، (الرحمٰن: ۲۹)] ہے۔

عادت میں تکرار ہوتی ہے، مگر عَود کرنے والے امر کی ایک حقیقت بھی ہوتی ہے جو ذہن و عقل میں موجود رہتی ہے اور متغیر نہیں ہوتی۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانیت زید میں، عمرو میں یعنی دونوں میں ایک ہی ہے اور انسانیت نے عَود نہیں کیا۔ اس وجہ سے کہ انسانیت عَود کرتی تو وہ کثیر ہو جاتی۔ حالاں کہ وہ ایک حقیقت

ہے اور جو چیز ایک ہوتی ہے بنفسہٖ وخود بخود کثیر نہیں ہوتی۔ ہم کو معلوم ہے کہ شخص کے لحاظ میں زید میں عمرو نہیں ہے، مگر زید کا تشخص عمرو کا تشخص نہیں ہے۔ پھر ہم دو چیزوں میں باوجود جدا جدا تشخص کے پائے جانے کے کہتے ہیں کہ انسانیت نے عَود کیا۔ کیوں کہ انسانیت کی وجہ سے اس کے اجزا میں مشابہت پیدا ہوئی ہے۔ حکم صحیح میں باعتبار ماہیت و حقیقت کے عَود کہاں ہے! غرض کہ یہ مِن وجہ (ایک صورت سے) جزا ہے اور مِن وجہ (یعنی دوسری صورت میں) جزا نہیں (بھی) ہے، اس لیے کہ جزا بھی من جملہ اور حالاتِ ممکن کے ایک حال ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے کہ جس کو علماے معارف نے ترک کر دیا ہے، یعنی اس کی توضیح جیسی چاہیے، نہ کی۔ یہ بات نہیں کہ وہ جانتے ہی نہ تھے۔ اس وجہ سے کہ یہ مسئلہ، تقدیر کے اسرار میں سے ہے جس کی تمام خلائق پر حکومت ہے۔

جاننا چاہیے کہ جیسے طبیب کو خادم طبیعت (یا ڈاکٹر) کہا جاتا ہے ویسے ہی انبیا و رسل اور ان کے ورثا یعنی علما کو عام طور سے لوگ خادم امر الٰہی کہتے ہیں۔ (وہ) فی الحقیقت انبیا و علما احوالِ ممکنات کے خادم ہیں، من جملہ ان کے اُن حالات کے جس پر وہ اپنے اعیان ثابتہ کے وقت علم الٰہی میں تھے۔ دیکھو! یہ کیا تعجب انگیز بات ہے کہ اشرف، خادم اخس و اولیٰ ہے مگر یہاں خادم مذکور اپنے مخدوم کے اقتضاے مرسوم کے پاس ٹھیرے رہتے ہیں۔ نہ کم کرتے ہیں نہ زیادہ۔ یہ حکم و اقتضا دو طرح پر ہوتے ہیں۔ اقتضاے حال و اقتضاے قال۔ یہ خدمت بھی علی العموم نہیں ہے۔۔۔ دیکھو! طبیب کو خادم طبیعت اُس وقت کہتے ہیں جب وہ طبیعت کی مدد کرے، کیوں کہ طبیعت نے مریض کے جسم میں ایک خاص قسم کا مزاج پیدا کیا ہے جس کے سبب اس شخص کا نام مریض رکھا گیا۔ اگر طبیب علی العموم ہر طبیعت کی مدد کرتا تو بیمار کی بیماری بڑھا دیتا۔ طبیب تو طبیعت کو روکتا ہے کہ صحت حاصل ہو۔ اس لیے کہ صحت بھی طبیعت کے خواص سے ہے۔ صحت کس طرح حاصل ہوتی ہے۔۔۔؟ موجودہ مزاج کے مخالف مزاج پیدا کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ طبیب (یا ڈاکٹر) علی العموم خادم طبیعت نہیں ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اصلاح جسم مریض اور تغیر مزاج کرتا ہے تو طبیعت ہی کی مدد سے کرتا ہے۔ لہٰذا طبیب، طبیعت کی مدد، خاص وجہ سے کرتا ہے نہ کہ عام طور سے۔ عموم اس مسئلے میں صحیح نہیں۔ پس طبیب، طبیعت کا خادم ہے بھی اور نہیں بھی۔

ایسا ہی انبیا اور علماے ورثۃ الانبیا کا حال ہے۔ خدمتِ حق میں واضح ہو کہ جیسا عینِ ثابتہ و حقائق اشیا وصور علمیہ ہوتے ہیں، حق تعالیٰ ویسا ہی جانتا ہے۔ جیسا جانتا ہے (اور) جیسی استعداد ملاحظہ فرماتا ہے ویسا ہی اس پر صورتِ خارجی عطا کرتا ہے۔ ہر شئے کو اس کے لوازم و خواص مرحمت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیا کے ذریعے سے اوامر و نواہی سے اطلاع دیتا ہے۔ جن کی استعداد، جن کی فطرت اچھی ہوتی ہے اوامر کو قبول کرتے ہیں۔

نواھی سے اجتناب کرتے ہیں۔ جن کی استعداد بد ہوتی ہے بدی کو قبول کرتے ہیں۔ ان اوامر ونواہی کو امر تکلیفی کہتے ہیں۔ امر تکلیفی سے ہر ایک کی قابلیت واستعداد وفطرت نمایاں ہوتی ہے۔ پس امر الٰہی دو طرح پر ہے۔ ۱) امر تکلیفی: جو انبیا کے ذریعے سے امت کو دیا جاتا ہے۔ ۲) امر تکوینی :یعنی کُن کا امر کرنا۔ عینِ ثابتہ کی استعداد ہوتی ہے تو کُن فرما کر بندے کے افعال کو پیدا کر دیتا ہے۔ استعداد نہیں ہوتی تو امر تکلیفی تو دیتا ہے مگر امر تکوینی نہیں دیتا۔ لہٰذا خلافِ استعداد وفطرت، افعال نمایاں نہیں ہوتے۔

امر حق، مکلفین کے حق میں دو طرح پر ہے۔ ۱) یہ کہ حکم کیا جاتا ہے اور مامور بہ کے واقع ہونے کا علم الٰہی میں ارادہ بھی رہتا ہے۔ اس لیے کہ وہ مقتضائے حالِ عین ہے۔ ۲) یہ کہ حکم کیا جاتا ہے مگر مامور بہ کے واقع ہونے کا علم الٰہی میں ارادہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ خلافِ فطرت واستعدادِ عین ہے۔ پھر بندے سے موافق ارادۂ حق کے امر صادر ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ کا ارادہ اس کے ساتھ موافق علم الٰہی کے ہوتا ہے۔ علم الٰہی، معلوم یعنی عینِ ثابتہ کے اپنی ذات کا علم دینے کے موافق ہوا۔ یعنی جیسی چیز ہوگی اس کا علم ویسا ہی ہوگا۔ پس معلوم اپنی ہی صورت پر ظاہر ہوا۔ لہٰذا انبیا اور ورثۃ الانبیا، ارادے کے ساتھ امر الٰہی کے خادم ہیں۔ وہ مطلق ارادے کے خادم نہیں۔ انبیا، مکلف سے مضر چیزوں کو دفع کرتے ہیں کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور اس میں بندے کی سعادت ہے۔ اگر وہ مطلق ارادۂ الٰہی کے تابع ہوتے تو ابدی اشقیا (یا دائمی بدبخت) کو وعظ وپند نہ کرتے۔ پس انبیا اور ورثۃ الانبیا لوگوں کے طبیب اُخروی ہیں۔ جب ان کو اللہ تعالیٰ حکم تکلیفی دیتا ہے تو وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں اور تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے امر تکلیفی اور ارادہ وامر تکوینی کے طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امر تکلیفی کبھی ارادۂ الٰہی وامر تکوینی کے مخالف بھی ہوتا ہے، اور موافق بھی ہوتا ہے۔ وجود میں آتا وہی ہے جس کا ارادہ اللہ نے کیا اور امر تکوینی کیا۔ اسی لیے پہلے امر ہوتا ہے، پھر اس کا ارادہ فرماتا ہے تو واقع وموجود ہوتا ہے۔ جس مامور بہ کے مامور سے واقع ہونے کا ارادہ نہیں کیا جاتا، (اور) اس کی استعداد کے باہر ہوتا ہے تو وہ مامور سے واقع نہیں ہوتا۔ مامور بہ کے مامور سے اس نہ واقع ہونے کا نام مخالفت اور عصیاں رکھا جاتا ہے۔

پس رسول، اللہ کے امر تکلیفی کا پہنچا دینے والا ہے۔ اسی واسطے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، شیبنی سورۃ ھود واخواتھا، (یعنی) مجھے سورۃ ھود وغیرہ نے بوڑھا کر دیا (الترمذي، صححہ الألباني في صحیح الجامع، شرح کتاب فیض القدیر، سنن سعید بن منصور)۔ ڈاڑھی میں سپیدی آگئی کیوں کہ اس سورۃ میں ہے فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ، (یعنی) جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے اس پر تم مستقیم رہو۔ استقامت اختیار کرو، (ھود:۱۱۲)۔ آپ ؐ کو كَمَا أُمِرْتَ کے الفاظ نے بوڑھا کر دیا کیوں کہ آپ کو کبھی اس کا علم نہ دیا جاتا کہ کیا ارادے کے موافق امر تکلیفی دیا گیا ہے، کہ واقع ہو یا یہ امر تکلیفی

خلافِ ارادہ وامر تکوینی ہے، کہ واقع نہ ہو۔ اکثر اشخاص، ارادہ وامر تکوینی کو بغیر واقع ہونے کے نہیں جانتے یعنی واقع ہونے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر تکوینی تھا۔ ارادۂ الٰہی یوں تھا۔ اس عین کی فطرت یہ تھی۔ اس کی استعداد ایسی تھی۔ مگر یہ کہ اللہ نے اس کی چشم بصیرت سے حجاب اٹھادیا ہو۔ اور اس نے اعیانِ ممکنات کو حالِ ثبوت، قبلِ وجود جیسے ہیں ویسا ہی جان لیا ہو۔ پھر اس وقت وہ جیسا دیکھتا ہے حکم کرتا ہے۔ یہ انکشاف کبھی کبھی کسی کسی کو تھوڑی دیر اور محدود زمانے کے لیے ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ کہیں، مَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ (یعنی) میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا، (الاحقاف:۹)۔ یعنی اعلم عباد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجاب کی بھی تصریح کر دی۔ کشف صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ بعض امورِ خاص پر اطلاع ہو جائے۔

واضح ہو کہ علم کئی طرح پر ہوتا ہے:

۱۔ علم بالذات: یہ اللہ تعالیٰ سے خاص ہے۔

۲۔ علم بالعرض: حقائقِ ممکنات پر تجلی علمی ہونے کے بعد ممکنات کو بھی علم ہوتا ہے مگر ان کی اصلی حالت، عدم علم ہے۔ بھلا جس کو اصلی وجود ہی نہ ہو گا اس کی کیا چیز اصل ہو گی۔۔۔ حیات ہے تو بالعرض وہ بھی محدود، حسبِ استعداد۔

۳۔ علم شہودی بھی ہوتا ہے جو آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ کانوں سے سنائی دیتا ہے۔ ہر طرح سے محسوس ہوتا ہے۔

۴۔ علم کشفی بھی ہوتا ہے جو مخصوص حضرات کو ہوتا ہے اور شہود کے برابر قوت نہیں رکھتا۔

(اس کے علاوہ) علم اجمالی بھی ہوتا ہے (اور) تفصیلی بھی ہوتا ہے۔ علم بذاتہٖ بھی ہوتا ہے (اور) باطّلاعِ دیگر بھی ہوتا ہے۔ علم تبلیغی و قابلِ اشاعت بھی ہوتا ہے۔ علم غیر تبلیغی اور سرّی بھی ہوتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ غیب بھی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ غیبِ مطلق اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ کا علم، وہ اسی کی ذات سے خاص ہے۔ بعض غیب ایک کے لحاظ سے تو غیب ہے مگر دوسرے کے لحاظ سے شہود ہے۔ یہ غیبِ اضافی ہے۔۔۔ اب آیاتِ ذیل پر غور کرو۔

وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ، (یعنی) اُس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، ان کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، (الانعام:۵۹)۔ أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ، (یعنی) کیا اُس کے پاس علم غیب ہے، (النجم:۳۵)۔ قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّـهُ، (یعنی) تم کہو غیب کی باتیں نہیں جانتا جو آسمان میں رہتا ہے یا زمین میں

رہتا ہے، بجز اللہ کے،(النمل:۶۵)۔ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا۔إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ (یعنی) اللہ عالم الغیب ہے، وہ غیب کو ظاہر نہیں کرتا کسی شخص پر مگر برگزیدہ پیغمبر پر،(الجن:۲۶ اور ۲۷)۔ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ،(یعنی) یہ غیب کی خبریں کہ ہم تم کو اس کی وحی کرتے ہیں،(اٰل عمران:۴۴)۔تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَـٰذَا،(یعنی) یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی وحی ہم تمھاری طرف کرتے ہیں جن کو اس سے پہلے تم نہ جانتے تھے نہ تمھاری قوم، (ھود:۴۹)۔وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ،(یعنی) میں نہیں جانتا کہ مجھ سے کیا کیا جائے گا، اور تم سے کیا،(الاحقاف:۹)۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّـهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا،(یعنی) اور تم کو ان سب کا علم دیا جن کو تم جانتے نہ تھے، تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے،(النساء:۱۱۳)۔ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ،(یعنی) اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو بہت کچھ خیر حاصل کر لیتا،(الاعراف: ۱۸۸)۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ علم ذاتِ حق اور علم بالذات، اللہ تعالیٰ سے خاص ہے۔ دوسرے امور کا علم بندوں کو اس کی علمی تجلی سے ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعے ہوتا ہے۔ القا و کشف سے ہوتا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ، اور اجمالاً سب کا علم دیا گیا ہے۔ حضرت (محمد ﷺ) میں علم اصل ہے، اور ہم میں جہل اصل ہے۔ ہم کو علم دیا جاتا ہے۔ حضرت (محمد ﷺ) سے بر بنائے حکمت کوئی چیز چھپا دی جاتی ہے یا بھلا دی جاتی ہے۔ لہٰذا نفی علم کو عدم بالذات، عدم تفصیل (اور) عدم شہود پر محمول کرنا چاہیے۔ اولین و آخرین کا بالذّات علم بھی اللہ تعالیٰ سے خاص ہے۔ اس سے رب و عبد کا علم مساوی نہیں ہوتا۔ غرض یہ کہ علم غیب کا مسئلہ صاف ہے۔ طرفین سے تکفیر علم کی تحقیر ہے۔

Siddiqui Publications